تیئیسواں سفر ۔ دمشق سے لندن، ہاتھی سے جمبو جیٹ

ہماری دمشق سے لندن کی پرواز سیرئین ایئر لائینز کے جمبو جیٹ، بوئنگ ۷۴۷ طیارہ سے صبح کے ۱۰ر بجے کے وقت تھی۔ شمس نے ہمیں بتایا کہ جمبو حبشہ کی سواحلی زبان میں ہاتھی کو کہتے ہیں۔ ہم نے بھی کہا کہ ٹھیک ہی تو ہے، ہم نے اپنی زندگی کا پہلا بڑا سفر ہاتھی ہی پر تو کیا تھا۔ وہ ۱۹۳۵ء تھا، یہ ۱۹۷۹ء۔ چوالیس سال گزر گئے تھے لیکن سواری کی حیثیت سے ہاتھی کی عزت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

دمشق سے لندن: ملک شام کی سیرین ایئر لائنز کا جمبو جیٹ

ایئر پورٹ پر پھر تھوڑی سی پوچھ گچھ ہوئی۔ ہم نے پیتل کے کچھ کڑے بی بی زینبؑ کے روضہ سے خریدے تھے جو بہت نفیس تھے۔ دمشق کے کسٹم آفیسر نے اُس پر زیادہ پوچھ گچھ کی۔ وہ اسے سونے کا سمجھ رہے تھے، اور شام کے باہر سونا لے جانا غالباً ممنوع تھا۔ انہوں نے اسے اندر کی طرف اچھی طرح سے گھس کر دیکھا اور مطمئن ہوئے تو ہم وہاں سے چلے۔ ایک بس نے ہمیں ٹرمینل سے ہوائی جہاز تک چھوڑا۔ یہ جمبو جیٹ اتنا اونچا تھا جیسے تین یا چار منزلہ مکان ہو۔ غرض ہم دوبارہ ایک سیکیوریٹی آفیسر سے نمٹ کر اوپر چڑھے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سانس پھول گئی۔ ہمارے ساتھ ہاتھ کا سامان بھی کافی تھا۔ اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد ہم نے

کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ نیچے ایئر لائنز کے کچھ افراد غالباً کسی تربیت کے لئے جا رہے تھے اور انہیں جہاز پر چھوڑنے ایئر لائنز کے دوسرے افراد بھی یہاں تک آ گئے تھے۔ ایک میلہ سا لگ گیا تھا۔

اس جمبو طیارہ نے جب رن وے پر دوڑنا شروع کیا تو لگتا نہیں تھا کہ یہ اٹھ سکے گا۔ کھڑکی سے رن وے ہمیں ایسے ہی دور لگ رہی تھی جیسی کہ ۱۹۳۵ء میں ایک بارات کے ہاتھی پر بیٹھ کر اُس وقت زمین دور لگ رہی تھی جب ہم تقریباً پانچ سال کے تھے۔ لیکن اس جہاز کو زمین چھوڑنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی، اور یونان کے شہر ایتھنز پہنچنے میں قریب قریب دو گھنٹے لگے۔ یہاں جہاز کو اترنا تھا۔ ایتھنز میں تھوڑی دیر رُک کر جہاز پھر روانہ ہوا۔ یورپ کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے ہم نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہر جگہ ابھی بھی برف جمی ہوئی تھی۔ جہاں شہر نظر آتے، وہ بہت اچھے لگتے۔ اس مرتبہ ہم لندن کے ہیتھرو ہوائی اڈّے پر اترے۔ ہوائی اڈّہ دیکھ کر ہمیں صحیح معنوں میں حیرت ہوئی۔ اتنا جدید، اتنا بڑا اور صاف ستھرا۔ ہم سوچنے لگے کہ ہم لوگ کیسے غافل رہے یا اپنی الجھنوں میں اتنے مصروف رہے کہ اِن لوگوں کو اپنے علم کی بدولت اتنا آگے جاتے نہ دیکھ سکے۔ ہمارے ذہن نے ہماری سوچ کو ایک شعر کی شکل میں ڈھال دیا .....

اگر خوابِ غفلت سے چونکے نہ ہم سب
آدا ! دِن گیا، وقتِ شام آ رہا ہے

ہیتھرو ہوائی اڈّے پر کسٹمز یا پاسپورٹ میں زیادہ جانچ پڑتال نہیں ہوئی۔ بس جلدی سے ایک مہر لگائی گئی اور ہم باہر آ گئے۔ یہاں سے ہم نے زمین دوز ٹرین لی اور لندن کے وکٹوریہ ٹرمینل پر اتر کر ہائیڈ پارک کارنر کے قریب ایک ہوٹل میں آ گئے۔ ہوٹل صاف ستھرا اور نفیس تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ یہ شہر کی تمام اہم عمارتوں کے قریب تھا اور تمام سفارتخانے بھی قریب ہی تھے۔ ابھی بھی تھوڑا دن باقی تھا تو ہم نے باہر جا کر ہائیڈ پارک کا ایک چکر لگا لیا۔ ماربل آرچ دیکھی۔ سخت سردی تھی اور بارش ہو رہی تھی، لیکن یہاں اسپیکرز کارنر میں ایک شخص کچھ تقریر کر رہا تھا اور اس کے سامنے کچھ اشخاص کھڑے ہوئے تقریر سن رہے تھے۔ شمس کو شک تھا کہ یہ سیکرٹ سروس کے ہرکارے ہونگے، ورنہ اس مقرّر کی تقریر اس موسم میں اور کون سنے گا۔ ہم ہوٹل واپس آ گئے۔ یہاں ہوٹل کا مالک اور منیجر موجود تھا اور شمس کو ان کے پچھلے کسی دورے سے جانتا تھا۔ یہ بمبئی (ممبئی) کے مسلمان، اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ یہیں رہائش رکھتے تھے۔ ان سے پاکستان پر بات چیت شروع ہوئی تو کہنے لگے، ''یہ بھٹو وزیرِ اعظم بہت اچھے تھے، اگر یہ کچھ عرصہ رہ جاتے تو پاکستان بہت اونچا جاتا''۔ اس وقت

ذوالفقار علی بھٹو وزیرِ اعظم کے عہدے سے معزول ہو چکے تھے اور اُن پر جنرل ضیا الحق مقدمہ چلوا رہے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے اٹھے، ہوٹل ہی میں ناشتہ کیا اور باہر نکلے۔ راستہ میں ہم نے کینسل گرین سیمیٹری دیکھی، جو ایک قدیم قبرستان ہے، اور یہاں ۱۸۵۷ء کی ہندوستانی جنگِ آزادی میں مرنے والے برطانوی سپاہی دفن ہیں۔ یہ انہیں شہید کہتے ہیں، اور اس جنگِ آزادی کو یہاں اُس وقت بھی بغاوت کے نام سے لکھا گیا تھا۔ یہاں سے ہم نے زمین دوز ٹرین لی اور ٹریفیلگر اسکوائر گئے۔ ٹریفیلگر اسکوائر میں ایک اونچے مینار پر انگلستانی لارڈ نیلسن کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ بہت اونچا مینار ہے، ۱۸۵ فٹ اونچا، یعنی پندرہ منزلہ عمارت جتنا۔ مینار کے چاروں طرف تانبے سے بنے ہوئے شیروں کے چار ضخیم مجسمے تھے جو ہوا اور پانی کے اثر سے کچھ سبز، سرمئی ہو چکے تھے۔ ہر طرف کبوتر جو ہاتھوں سے دانے چھیننے کو تیار، ہر طرف اڑتے پھر رہے تھے۔ شُکر تھا کہ بارش اور برفباری ہو رہی تھی، ورنہ ان کی غلاظت اور تنگ کرتی۔ یہ اتوار کا دن تھا، اور یہاں مجمع تھا۔ آس پاس کئی گرجا ہیں اور لندن کی نیشنل گیلری بھی یہیں ہے۔ وہاں کا مجمع بھی ادھر سے گزرتا تھا۔

لندن: ٹریفلگر اسکوائر پر نیلسن کا مجسمہ .....اور..... بکنگھم پیلس کے سامنے حجرے میں گھوڑسوار گارڈ

برف باری اب ہلکی بارش میں تبدیل ہو گئی تھی، اور یہ ہمیں گیلا کر رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ مقامی لوگ یا تو گھروں میں دبکے بیٹھے ہوں گے، یا کہیں گرم علاقوں میں چھٹی منا رہے ہونگے۔ یہاں ہم گرم علاقوں

کو چھوڑ کر اس برف میں آئے ہیں۔ یورپ میں یہ موسم بہار کی چھٹیوں کا زمانہ ہوگا کیونکہ ہم نے سڑکوں پر بہت ایسے نوجوان دیکھے جو طالب علم لگ رہے تھے۔ اس کے بعد ہم پکاڈلی سے ہوتے ہوئے چلے۔ یہاں بہت سے سنیما اور تھیٹر ہیں۔ ہر طرف دیواروں پر کاغذ کے اشتہار تھے، کافی گندگی تھی، اور طرح طرح کے لوگ تھے جو ایسے نہیں تھے کہ ہم اُن پر اعتبار کر سکتے۔ ایک سڑک پار کرنے کے لئے ہم نے زمین دوز راستہ لیا۔ یہاں ایک شخص گٹار بجا رہا تھا۔ اِس نے اپنے سامنے اپنا ہیٹ رکھا ہوا تھا اور کچھ لوگ اس میں پیسے ڈالتے جا رہے تھے۔ ہم آگے بڑھ گئے، چیئرنگ کراس پار کیا اور یہی دیکھتے ہوئے ہم بکنگھم پیلس پہنچے۔

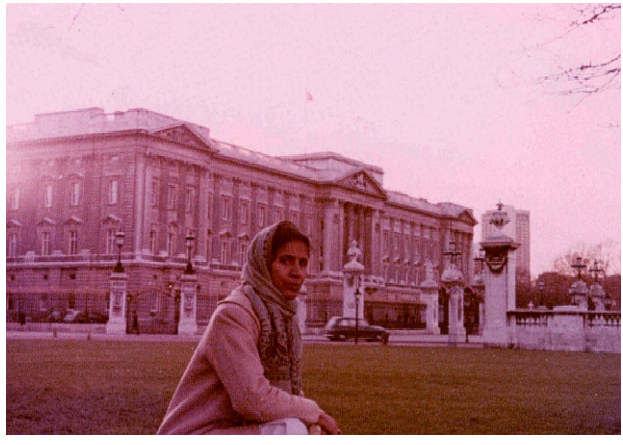

لندن: بکنگھم پیلس کے سامنے۔ اندر نمعلوم کیسا موسم ہو، لیکن ہمارے چہرے سے ظاہر ہے کہ باہر بہت ٹھنڈ تھی۔

بکنگھم پیلس ایک خوبصورت عمارت لگی۔ سامنے دریچوں میں لال کوٹ پہنے ہوئے سپاہی کھڑے تھے۔ کیا مجال کہ ہل تو جائیں یا نظریں گھما لیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں نواب رامپور کے سپاہی یاد آئے جو خاص باغ پیلس اور قلعہ رامپور پر اسی طرح کھڑے ہوتے تھے۔ ان سپاہیوں کے سامنے کچھ بچے اور کچھ بڑے، جو غالباً امریکی تھے، اُن کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ شاید وہ اُن کو ہنسا کر ہلا دیں۔ اتنے میں ۱۱ بج گئے اور یہ ان سپاہیوں کی نفری بدلنے کا وقت تھا۔ اسے یہاں ''چینج آف گارڈ'' کہتے ہیں۔ ہر سیاح نے کیمرہ نکال لیا۔ یہ ہنگامہ بھی پندرہ منٹ میں ختم ہوا تو پھر یہ سپاہی کسی مجسّمے کی طرح کھڑے ہو گئے۔ ہم آگے بڑھ آئے۔

یہاں سے نکل کر ہم نے لندن کا ٹاور برج دیکھا۔ بس یونہی سا تھا، نیلے سے رنگ کا۔ نیچے دریائے ٹیمز میں بڑی کشتیاں گزریں تو یہ بیچ میں سے کھل جاتا ہے اور دونوں حصے اوپر اُٹھ جاتے ہیں۔ پانچ منٹ

لگائے، ایک تصویر لی اور آگے بڑھ گئے۔ دریائے ٹیمز کو پار کر کے پھر چیئرنگ کراس کی طرف چلتے رہے۔ سردی ابھی بھی بہت زیادہ تھی۔ یہاں لندن کے بگ بین نے تین بجنے کا اعلان کیا۔ ہم نے اس کے سامنے کچھ تصویریں کھنچوائیں اور سوچنے لگے کہ تصویریں کھنچوانے کے علاوہ بگ بین کلاک ٹاور اور اس کے ساتھ کے پارلیمنٹ ہاؤس پر ہم کیا دیکھ سکتے تھے۔ یہ محض خوبصورت عمارتیں تھیں جو ان کی مالی حالات کی مظہر تھیں۔

لندن: دائیں طرف ہاؤسز آف پارلیمنٹ .....اور..... بائیں طرف بگ بین کلاک ٹاور۔ تصویر میں آسمان کچھ پیلا نظر آرہا ہے کہ سورج ڈوب رہا تھا اور بادلوں کے نیچے اس کی روشنی سے پورے آسمان پر زردی پھیل گئی تھی۔

یہاں کے صاف ستھرے بازار، زمین دوز ٹرینیں جو وقت پر چلتی تھیں، اور بسیں جن کے ڈرائیور سلیقے سے بس روکتے تھے، مسافروں کو بٹھاتے، اور اتارتے تھے۔ دروازے بجلی سے بند ہونے والے تھے۔ کچھ موسم کی ضرورت تھی۔ ہر بس گرم رکھی جاتی تھی۔ ہم نے ایک جگہ رُک کر کھانا کھایا۔ ہوٹل ہی سے بسکٹ ساتھ رکھ لئے تھے۔ بس چائے لی اور دودھ۔ ہم یہاں عام ہوٹلوں سے کچھ کھانا نہیں چاہتے تھے کہ ہر جگہ گوشت سور کا ہی ہوتا تھا۔ سبزیاں انگلستان میں کم پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں کی مچھلی اچھی ہوتی ہے۔ ہمیں مچھلی کے بارے میں بھی شک تھا کہ وہ صحیح ہو یا نہیں۔ کچھ توانائی آئی اور گرمی واپس آئی تو ہم ٹاور آف لندن گئے۔ ہم نے سب سے پہلے ٹاور برج پر کھڑے ہو کر دو تصویریں کھنچوائیں۔ یہاں اس سردی کے باوجود سیاح فوٹوؤں پر فوٹو لے رہے تھے۔ نہ جانے کیسے آئے ہونگے اُن کے فوٹو، کہ روشنی تو بہت کم تھی۔ ٹاور آف لندن

اس برج کے بالکل ساتھ ہے۔ یہاں وقت بہت چاہیئے۔کوئی دو ہزار سال پہلے یہاں رومن بادشاہوں نے ایک قلعہ بنایا تھا۔ پھر ایک ہزار سال پہلے اسی جگہ انگریزوں نے یہ قلعہ بنایا۔ ہم اندر جانے کے لئے ایک چھوٹے سے پل پر گزرے جو ایک خشک خندق کے اوپر تھا۔ ۶/ پاؤنڈ کا ٹکٹ لیا۔ ہم نے خاص خاص چیزیں دیکھیں۔ یہاں پر عالیشان شاہی زیورات نمائش پر ہیں۔تمام دنیا سے لوٹ مار کے جمع کیا ہوا سامان تھا۔ یہاں ہم نے مشہور ہیرا ''کوہِ نور'' دیکھا جو ملکہ الزبتھ کے تاج میں لگا ہوا تھا۔ یہ ہیرا تاریخ میں اکثر مغل بادشاہوں کے پاس رہا، اور آخر میں پشاور کے گورنر شاہ شجاع سے نکل کر پنجاب کے نو یا دس سالہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس پہنچا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۰ء میں جنگ کر کے پنجاب کے ساتھ یہ ہیرا بھی فتح کرلیا اور ملکہ وکٹوریہ کو ''تحفے'' میں دے دیا۔ اس کا اب ''حشر'' ہوگیا ہے کیونکہ تاریخ کے مطابق یہ ۷۵۰/ قیراط سے اب قریبا ۱۰۶/ قیراط کا رہ گیا ہے۔ یہاں اس کے علاوہ شاہِ ایران کا تخت، اور انگریزی بادشاہوں کے لباس، تاج، ہتھیار، اور قید خانے دیکھے۔ ہر طرح کے سزا دینے کے طریقے اور اوزار دیکھے۔لگتا تھا کہ پاکستانی پولیس کا ٹریننگ سینٹر ہو۔ یہاں ایک ٹاور دیکھا جس میں شاہ ہنری نے شیر، چیتے اور بھالو رکھے تھے۔اسی طرح ایک ٹاور کا نام ہے بلڈی ٹاور، یعنی خونی مینارہ۔ یہاں طرح طرح کے قتل اور سازشوں کی تاریخ ہے۔اس میں ۱۳/ سالہ شہزادوں سے لے کر ججوں، شہزادیوں اور پادریوں کی گردن زدنی اور زندہ جلانے کے واقعات ہمیں یہاں کی ٹورسٹ گائڈ بک سے معلوم ہوئے اور کچھ یہاں کے ٹورسٹ گائیڈ سے، جس نے کافی نمک مرچ لگا کر، چٹخارے لیتے ہوئے وہی کہانیاں اپنے سامعین کو سنائیں۔ ہم نے یہ جگہیں دیکھیں تو ہمیں یاد آیا کہ رامپور میں ہم نے رضا لائبریری کے عرشی صاحب سے ایک کتاب لے کر پڑھی تھی جس کا نام تھا ''فسانۂ لندن''۔اس وقت اس کتاب میں لکھے ہوئے بیانات یہاں سمجھ میں آرہے تھے۔

ایک عمارت تھی وائٹ ٹاور، جس کے اندر ایک گرجا ہے۔ ہم اندر گئے۔ سنا تھا کہ اس کے نیچے ایک کنواں ہے جو دو ہزار سال پرانا ہے۔ ہم نے اس کو تو چھوڑا لیکن یہ دیکھا کہ اس عمارت میں اس قدر ہتھیار تھے کہ خدا کی پناہ۔ طرح طرح کی بندوقیں، مختلف وزن کے زرہ بکتر، تلواریں ہر طرح کی۔ ان میں سے اکثر ہتھیار ہم رامپور کے قلعے میں دیکھ چکے تھے، لیکن یہاں ایذاءرسانی کا بھی انتظام تھا۔ نمائش میں کچھ تلواریں ایسی تھیں جو خاص طور پر انسانی جسم میں جا کر مختلف اعضاء کو باہر کھینچ لانے کے لئے بنائی گئی تھیں۔اس کے علاوہ ناخن کھینچنے کے اوزار، اور ہڈیاں توڑنے کے خاص ہتھوڑے وغیرہ بھی تھے۔ ہم یہی دیکھ کر باہر آگئے اور اسی

میں کنواں دیکھنا بھول گئے۔ باہر آئے تو دیکھا کہ ایک جگہ لکڑی کا ایک بلاک رکھا ہوا تھا۔ یہاں روایت ہے کہ تین ملکہ خواتین اور دوسرے شہزادوں کے سر قلم کئے گئے تھے۔ اس کے بعد ہم باہر آ گئے۔ کچھ دیر مزید یہاں کی پرانی عمارتیں دیکھیں، کچھ پرانی فوجی بیریکس بھی تھیں۔ بیریکس کی عمارت خوبصورت تھی، لیکن ہمت نہیں ہوئی کہ اندر جا کر مزید وقت صرف کرتے کہ سب چیزیں ایک ہی جیسی لگنے لگی تھیں۔

لندن: ٹاور آف لندن، بیریکس

شام ہوگئی تھی، ہم نے ہوٹل کے لئے پکاڈیلی سرکس سے زمین دوز ٹرین لی اور واپس آئے تو ہوٹل کے مالک اور ان کی بیگم نے استقبال کیا۔ ان سے کچھ بات چیت رہی، پھر ہم اپنے کمرے میں گئے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر نکلنے کو تیار تھے۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ اپنے ایک عزیز سے مل لیتے۔ یہ نائٹس برج کے علاقے میں ہائیڈ پارک کے پاس رہتے تھے۔ ہم نے ان کو فون پر فون کئے، یہ نہ مل سکے۔ اُس زمانے میں ٹیلیفون کے ساتھ پیغام چھوڑنے کے لئے ٹیپ ریکارڈر ابھی ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ ہمارے ایک اور عزیز لندن کے نواح میں رہتے تھے، ان کو بھی فون کیا تو وہ مل گئے۔ یہ غیر شادی شدہ تھے اور ہمارے بیٹے سے کوئی آٹھ، دس سال بڑے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے نائٹس برج والے عزیز تو ہندوستان گئے ہیں، کچھ سردی سے بچنے کے لئے اور کچھ کاروبار کے سلسلے میں۔ انہوں نے اپنا پتہ بتایا اور وہاں کے لئے ٹرین پکڑنے کے بارے میں ہدایات دیں۔ ہم نے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر لیا۔

تیسرے دن ۱۹/ مارچ تھی۔ ہم نے کوشش کی کہ ہم ہندوستان کا ویزا لندن سے لے لیں۔ ناکامی ہوئی۔ پھر عراق کا ویزا چاہا، تو وہ بھی بیکار۔ سب یہی کہتے کہ پاکستان سے ویزا لیں۔ سعودی عرب کے

سفارتخانے گئے۔ یہ ہائیڈ پارک سے قریب ہی تھا۔ یہاں دو قطاریں تھیں۔ ایک قطار برطانوی لوگوں کے لئے جو بہت لمبی تھی اور یہ لوگ سعودی عرب میں ملازمت کے سلسلہ میں ویزے کی درخواست دینے کے لئے کھڑے تھے۔ اس قطار میں باری دو گھنٹے سے کم میں نہیں آسکتی تھی پھر بھی یہ لوگ باہر سردی اور بارش میں سکون سے کھڑے تھے۔ دوسری قطار ہم جیسوں کے لئے تھی۔ ہمیں پانچ منٹ میں اندر جانے کا موقع مل گیا اور آدھے گھنٹے میں ہم باہر آ گئے۔ انہوں نے ہمارا پاسپورٹ اور درخواست رکھ لی اور دوسرے دن بلا لیا۔

ہم ان تمام سفارتخانوں سے تقریباً ۱۰/ بجے تک فارغ ہو چکے تھے۔ اب ہم لندن دیکھنے چلے تھے کہ برفباری شروع ہوگئی۔ ہم نے ہمّت نہ ہاری کہ ہمّتِ خاتون، مددِ خدا۔ آج ہمارا برٹش میوزیم دیکھنے کا منصوبہ تھا۔ تھوڑی دور تو سڑک پر چلے، پھر سردی کی وجہ سے زمین دوز ٹرین لی اور اگلے اسٹیشن پر اتر گئے، جو آکسفورڈ اسٹریٹ کے برابر تھا۔ یہاں بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ اسی پر چلتے ہوئے ہم برٹش میوزیم میں آ گئے۔

برٹش میوزیم میں مصر کی اشیاء کا ایک پورا میوزیم ہے۔ یہاں ہم نے درجنوں کی تعداد میں مصر کی ممیّز دیکھیں۔ ایسے قیمتی مجسّمے کہ مصری قوم ان کے لئے روتی ہوگی۔ ایک یونان کا حصہ تھا جہاں مختلف محلّات کے دروازے بھی تھے، خاص پتھر تھے، اور طرح طرح کے مجسّمے تھے۔ ان میں ایک گھوڑے اور ایک شیر کا مجسمہ دیکھنے والا تھا۔ ایک حصہ میں ہندو اور بدھ مجسّمے تھے۔ یہاں رام کرشن، کالی ماں اور گوتم بدھ کے مجسّمے تھے۔ سانچی کے محل کے ٹکڑے، لکڑی کا کام، پتھر پر نقش نگاری کا کام، اور ھٹّے بھی تھے۔ مسلمانوں کی اشیاء کا بھی الگ حصہ تھا، اور انتہائی قدیم، ہاتھ سے لکھے ہوئے عربی، ایرانی اور ترکی قرآنی نسخے تھے۔ اس کے علاوہ تمام دنیا سے لائے ہوئے زیورات اور قیمتی پتھر یہاں موجود تھے۔ مختلف زمانوں کے اور دینا کے مختلف کناروں کے زیورات کے الگ حصے تھے۔ ہندوستان کے زیورات کا ایک الگ حصہ تھا۔ اس کے علاوہ افریقہ، جنوبی امریکہ، اور غرض ہر جگہ کی قیمتی اشیاء یہاں موجود تھیں۔ چین کے قیمتی گلدان، اور دوسرے برتن تھے۔ مختلف زمانوں کے اور مختلف قوموں کے سکّے تھے۔ انڈونیشیا اور آسٹریلیا کے قریبی جزیروں کی بہت سی مورتیاں اور وہاں کی روزمرّہ کے استعمال کی اشیاء بھی تھیں۔ اس کے علاوہ کنگھیاں، کھڑاؤں، اور مختلف محلّات سے اتارے ہوئے خاص مقصد کے پتھر یہاں موجود تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ جن قوموں کی یہ چیزیں ہیں ان کا اگر بس چلے تو وہ انگریزوں سے یہ ساری چیزیں ابھی لے لیں۔ پھر ہم نے یہ بھی سوچا کہ وہ قومیں انہیں لے لیں

تو کیا پتہ یہ اشیاء کہاں غائب ہو جائیں۔ ایسی ہی نمعلوم کتنی قدیم اشیاء پاکستان میں غائب ہو گئیں ہیں۔

کہتے ہیں کہ اس میوزیم کو دیکھنے کے لئے ایک ہفتہ چاہیئے۔ ہم نے اس پر پورا دن لگا دیا۔ اس شام ہمیں اپنے عزیز کے ہاں جانا تھا جن سے ہم نے پچھلے ہی دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لہذا ہم باہر نکل آئے۔ موسم ابھی بھی سرد تھا اور تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ ہم نے زمین دوز ٹرین لی اور اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ انہیں ٹیلیفون کیا کہ وہ ہوٹل ہی آ جائیں، ہم کہاں راستہ بھٹکتے پھریں گے۔ ابھی تھوڑی دیر آرام کیا ہی تھا کہ یہ صاحب آ گئے۔ مرتضٰی معظم نام ہے۔ یہ دن میں کام میں مصروف تھے، اب شام کو ہماری طرف چلے آئے۔ آتے ہی کہنے لگے چلیں کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔ ہمیں ایک سانچی پان کی دُکان لے گئے تو ہم بہت متاثر ہوئے کہ لندن میں پان کھلا رہے تھے۔ اس کے بعد ہم تینوں ایک اسٹیج ڈرامہ دیکھنے گئے۔ یہاں اس قدر مجمع تھا کہ ہمیں کار کھڑی کرنے کی بھی جگہ نہ مل سکی۔ اب انہوں نے ہم سے کہا، ''چلیں، ہم آپ کو قیمہ بھرے شیر مال کھلاتے ہیں''۔ نیکی اور پوچھ پوچھ؟ ہم تیار ہو گئے۔ ریستوران پہنچتے پہنچتے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ویٹر سے شیر مال لانے کا کہا۔ تین گرما گرم شیر مال، ٹھنڈا مشروب اور سلاد آئی، تو ہم نے ایک لقمہ توڑا اور منہ میں لیا ہی تھا کہ یہ بولے، ''آپ کو معلوم ہے کہ یہ قیمہ کس کا ہے؟'' ہمارا ہاتھ رک گیا۔ وہ کہنے لگے، ''ہوسکتا ہے سور کا ہو''۔ ہمارا ہاتھ بالکل ہی رک گیا اور میز سے بھی الگ ہو گیا۔ اب یہ ہنسنے لگے، کہ مذاق کر رہے تھے۔ مسلمان آدمی کا ریستوراں تھا۔ لیکن اب ہم سے یہ نہیں کھائے گئے اور تینوں شیر مال ان دونوں نے ختم کئے۔ اب یہ سر ہو گئے کہ ہمیں پوری کباب کھلائیں گئے۔ ہم تیار ہو گئے۔ رات کے ۱ر بجے ایک دوسرے ریستوراں میں پہنچے تو یہاں کے منیجر اور ان کی بیٹی جماہیاں لیتے ہوئے ملے۔ مرتضٰی کے جاننے والے تھے، لہذا ہمارے لئے کھانا لانے پر راضی ہو گئے ان کا باورچی جا چکا تھا سو خود ہی اندر سے چار چھ گھنٹے پرانی پوریاں اور کباب لائے۔ کہنے لگے کہ ''ریستوراں تو بند ہو چکا، لہذا کھانا ایک ڈبّہ ہی میں مل سکتا ہے''۔ ہمارے لئے بھی یہی بہتر تھا کہ راستے میں کار میں کھا لیں۔ نیند بری طرح آ رہی تھی۔ واپسی میں سارے راستے مرتضٰی ہمیں مختلف علاقوں کے بارے میں بتاتے رہے لیکن ہم غنودگی میں کچھ نہ سمجھ پائے۔ ہوٹل پہنچے تو بستر پر لیٹتے ہی سو گئے۔

اگلے دن، ۲۰ر مارچ کی صبح جب ہم ناشتہ کرنے نیچے گئے تو ہوٹل کا مالک منیجر بھی آ گیا اور ساتھ ان کی بیگم بھی اور مشورہ دیا کہ مادام تساؤ کا میوزیم ضرور دیکھیں۔ ہمارا بھی ارادہ تو تھا یہ دیکھنے کا، لہذا ہم بھی

تیار ہو گئے ۔ ہوٹل سے نکلے اور پہلے سعودی سفارتخانہ گئے ۔ وہاں پاسپورٹ پہلے ہی تیار رکھے تھے اور ہمیں پانچ منٹ میں فراغت مل گئی ۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ کم از کم یہاں پر پاکستان جیسی تکلیف نہیں ہوئی ۔ اب ہم ویسٹ منسٹر ابی گئے ، جو ایک گرجا ہے ۔ یہ پندرہ منٹ سے زیادہ کی جگہ نہیں ہے ۔ اسے دیکھا پھر زمین دوز ٹرین لے کر بیکر اسٹریٹ اسٹیشن پر اترے اور مادام تساؤ کے موم کے عجائب گھر گئے ۔ ٹکٹ زیادہ مہنگا لگا ۔ ہم ہر پاؤنڈ کو روپوں میں بدل کے سوچتے تو ہر ٹکٹ ہی ۳۰۰ ر سے ۴۰۰ ر روپے تک کا نظر آتا تھا ۔ اندر داخل ہوئے ۔ الٹے ہاتھ پر معلومات کا کاؤنٹر بنا تھا ۔ ہم اور شمس اِدھر گئے تا کہ وہاں کھڑے ہوئے اس عمر دراز شخص سے کچھ معلومات لیں ۔ اب شمس اس سے سوال کئے جائیں اور وہ جواب ہی نہ دے ، اور نہ ہی ہل کے دے ۔ بہت غور سے دیکھا تو یہ ایک موم مجسمہ تھا ۔ کچھ کھسیا کر اندر گئے تو ہمیں یہاں شہنشاہ ایران ، جنرل ایوب خان ، جواہر لال نہرو ، لال بہادر شاستری ، اور ذوالفقار علی بھٹو کے مجسمے نظر آئے ۔ اس کے علاوہ فلمی اداکاروں کے مجسمے بھی تھے ۔ بیٹلز کا پورا گروپ یہاں موجود تھا ۔ ہم نے دو ایک ہستیوں کے ساتھ ایک ایک تصویر کھنچوائی ۔

لندن : مادام تساؤ کے موم مجسّمے ۔ دائیں طرف ہال آف فیم میں شاہی خاندان ، بائیں طرف مہاتما گاندھی ۔

اس میوزیم کے تہہ خانے میں پھر توپ ، گولہ بارود اور جنگ و جدل کا سامان نظر آیا ۔ یہاں انہوں نے آوازوں سے مزید اثر بڑھایا تھا ۔ جلد ہی سارے مجسمے ایک جیسے لگنے لگے اور ہم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے باہر آنے لگے ۔ جیسے ہی دروازے سے نکلنے لگے تو معلومات کے اسی کاؤنٹر سے ایک آواز آئی ''شکریہ'' ، اور ساتھ میں ہمیں دوبارہ آنے کی دعوت دی گئی ۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو معلومات کے کاؤنٹر کا وہ مجسمہ آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر ہمیں دیکھ رہا تھا اور اب وہ مسکرا بھی رہا تھا۔ اب دیکھا تو یہ ایک اصلی انسان تھا جس نے پہلے خود کو مجسمہ ظاہر کر کے ہمیں اچھا تاثر دیا تھا۔ ہم لوگ مسکرا کر باہر نکل آئے۔

اب شام ہو چلی تھی۔ ہم نے تھوڑا پیدل چل کر دوبارہ ہائیڈ پارک کا رخ کیا۔ ماربل آرچ پر ایک تصویر لی، کہ سورج ڈھل کے چھدرے بادلوں کے نیچے آ گیا تھا اور اس کی چند شعائیں بادلوں کے نیچے سے آنے لگی تھیں۔ اس کے بعد ہم نے آکسفورڈ اسٹریٹ پر ایک اور چکر لگایا، اور پھر ٹرین لے کر دوبارہ ہائیڈ پارک کارنر کے اسٹیشن پر اترے۔ کافی تھک چکے تھے۔ ایک جگہ سے کچھ کھایا، اور چائے پی۔ پھر یہاں کے مشہور اسٹور ''ہیروڈز'' میں گئے۔ یہ بہت ہی مہنگا اسٹور نکلا۔ ہم مختلف طرح کے کپڑے دیکھتے رہے۔ یہاں ہمیں پانچ سو پاؤنڈ تک کے جوڑے نظر آئے جن میں سے ایک بھی ہمارے کام کا نہیں تھا۔ اتنی دیر میں اندر رہنے کی وجہ سے ہمارے اوپر ٹھنڈ کے اثرات مدہم پڑ چکے تھے، ہم باہر آئے اور ٹرین لے کر ہوٹل پہنچے۔ یہاں ہوٹل کی مالکہ ہم سے سیاحت کا حساب لینے کو تیار بیٹھی تھیں۔ سارا بتایا کہ ہم نے کیا کیا دیکھا تھا، اور انہوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ اب ہم لندن کا چڑیا گھر دیکھیں اور کیوگارڈنز بھی۔ رات کا کھانا دوبارہ مرتضٰی کے ساتھ کھایا، لیکن اس مرتبہ سکون سے ایک ہندوستانی ریستوراں میں بیٹھے اور دس بجے تک واپس آ گئے۔

لندن: بکنگھم پیلس کے سامنے ملکہ وکٹوریہ کا یہ مجسمہ قوم کو اچھے وقتوں کی یاد دلاتا ہے۔ مصنفہ بالکل دائیں جانب ہیں۔

۲۱ / مارچ لندن میں ہمارا آخری مکمل دن تھا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح ہمیں فرینکفرٹ کی پرواز لینی تھی۔ صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر باہر نکلے۔ آج تھوڑی روشنی تھی، ایک بار پھر بکنگھم پیلس کی طرف نکل گئے۔ رونق بھی زیادہ تھی۔ کچھ دیر یہاں وقت گزارا اور تصویریں لیں۔ پھر ہم نے ٹرین لی اور کیمڈن ٹاؤن کے

اسٹیشن پر اترے۔ یہاں سے تھوڑا سا چلیں تو ریجنٹ پارک کے کونے میں یہ چڑیا گھر تھا۔ یہ ایک عام سا چڑیا گھر تھا۔ وہی شیر، چیتے وغیرہ تھے۔ کافی بڑی جگہ تھی، لیکن ٹھنڈ اور بارشوں کی وجہ سے سب جانور اندر تھے۔ ہم نے کچھ سانپ وغیرہ بھی دیکھے جن میں ایک ۲۵ رفٹ کا ''ممبا'' افریقی یا جنوبی امریکہ کا سانپ بھی تھا۔ یہ سانپ کم ازکم دس یا بارہ انچ موٹا تھا اور ایک نوٹ کے مطابق اس کا وزن تقریباً ۱۲۰۰ر پاؤنڈ تھا۔ مختلف پرندے تھے۔ آدھے دن میں یہ پورا چڑیا گھر ختم ہوگیا۔ ہم باہر آئے کھانا وغیرہ لیا، اور ٹرین سے کیوگارڈنز کا ایک چکر لگا لیا۔ یہ بھی بس باغات ہی تھے، اور اس میں زیادہ کچھ نئی چیز نظر نہیں آئی۔ ہم سے دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ ایک تو برٹش لائبریری، اور دوسرے لندن کا یونیورسٹی کالج، جہاں ہمارے سسر نے کچھ سال پڑھا تھا۔ اسی اثناء میں سورج کافی نیچے آچکا تھا۔ ہم نے ہوٹل کی راہ لی۔ مرتضٰی پھر آئے تھے۔ ان سے ہم نے وعدہ لیا کہ کراچی آئیں تو ضرور ملیں، لیکن ہمیں بھی پتہ تھا کہ یہ کراچی نہیں آئیں گے۔ یہ ہندوستان سے براہِ راست انگلستان آئے تھے، اور اب یہیں رہتے تھے۔ پاکستان سے ان کا کوئی تعلق کبھی نہیں رہا تھا۔

اگلے دن ہمیں ناشتہ کرنے تک کا وقت نہیں ملا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر ٹرین سے ہیتھرو پہنچے۔ ہمارے پاس اس مرتبہ لفت ہنسا کا ٹکٹ تھا۔ یہ ایک ایئر بس طیارہ تھا جس نے بمشکل ایک گھنٹے میں ہمیں فرینکفرٹ پہنچا دیا۔ شمس کے مطابق ہوائی جہاز کا وقت پرواز کے راستے کے اصول کے مطابق اوپر جانے اور نیچے آنے میں لگا، کہ راستہ تقریباً ۲۰ منٹ کا تھا۔ سارے راستے ہوا میں اوپر نیچے اور دائیں بائیں طرح طرح کے طیارے نظر آتے رہے تھے، اس قدر ٹریفک کہ لالوکھیت کی چورنگی یا والنٹ کریک کی اگناسیو ویلی روڈ کا سماں تھا۔

فرینکفرٹ ایئرپورٹ: لفت ہنزا کا ایئر بس طیارہ

فرینکفرٹ کا ایئرپورٹ بھی ہیتھرو کی طرح جدید طرز کا تھا، لیکن چھتیں کافی نیچی تھیں۔ اہم چیز یہ تھی کہ یہاں سے نکلتے ہوئے ہمیں ایئرپورٹ پر امریکی فوجیوں کے لئے الگ دفتر نظر آئے۔ نظر آتا تھا کہ جرمنی کی جنگِ عظیم کی شکست ابھی تک جاری ہے۔